اِسلامی دستُور کی تدوین

[یہ وہ تقریر ہے جو ۲۴۔ نومبر ۱۹۵۲ء کو بار ایسوسی ایشن کراچی کے صدر جناب محمد محسن صاحب صدیقی کی دعوت پر ایک اجتماع میں کی گئی تھی۔]

حضرات! میں بار ایسوسی ایشن کے محترم صدر اور سیکرٹری کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ستھرے مجمع کے سامنے مجھے اپنے خیالات کے اظہار کا قیمتی موقعہ دیا۔ یہ ہماری قوم کا مکھن ہے اور اس کے کسی ایک فرد کو متفق کر لینا ہزاروں آدمیوں کے متفق کرنے کی نسبت زیادہ قیمتی اور وزنی ہے میں اس نادر موقعہ کی اہمیت کو اچھی طرح محسوس کرتا ہوں اور انشاء اللہ اس سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرونگا۔

میرا ارادہ یہاں کوئی مفصل تقریر کرنے کا تو نہیں ہے کیونکہ دراصل یہ ایک مجلسِ مذاکرہ ہے جو اسلامی دستور کی بنیادوں پر تبادلۂ خیال کرنے کے لیے منعقد کی گئی ہے۔ لیکن چونکہ یہ موضوع ایسا ہے کہ اس کے بارے میں اگر ابتداءً بطور مقدمہ چند باتیں بیان نہ کر دی جائیں تو اس امر کا اندیشہ ہے کہ مباحث کے دوران میں بہت سے ایسے مسائل چھڑ جائیں جن کو واضح کرنے کے لیے پھر ایک تقریر کرنے کی ضرورت پیش آئے، اس لیے میں پہلے چند اصولی باتیں وضاحت کے ساتھ بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد جو سوالات کیے جائیں گے ان کے جواب عرض کرونگا۔

مسئلے کی نوعیت ہمارے سامنے اس وقت جو مسئلہ پیش ہے اس کی نوعیت کو پہلے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اس ملک کا دستور اسلامی ہونا چاہیے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اسلامی دستور کہیں لکھا لکھایا موجود ہے اور مطالبہ صرف اسے نافذ کر دینے کا ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ جسے ہم کو حل کرنا ہے وہ یہ ہے کہ ہم ایک غیر تحریری دستور (Unwritten Constitution) کو ایک تحریری دستور (Written Constitution) میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں[1]۔ جس چیز کو ہم اسلامی دستور کہتے

[1] یہاں تحریری دستور کی اصطلاح کو اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔ دراصل اس سے مراد ایک (باقی صفحہ پر)

ہیں وہ دراصل ایک غیر تحریری دستور ہے اور اس کے چند مآخذ (Sources) ہیں جن سے استفادہ کر کے ہمیں اپنے ملک کے حالات کے مطابق ایک تحریری دستور مرتب کرنا ہے۔

غیر تحریری دستور دنیا میں کوئی انوکھی اور نرالی چیز نہیں ہے۔ اٹھارویں صدی تک دنیا کی ساری حکومتوں کے نظام غیر تحریری دستوروں پر چلتے رہے ہیں اور آج بھی دنیا کی ایک بہت بڑی سلطنت (سلطنت برطانیہ) بغیر کسی تحریری دستور کے چل رہی ہے۔ اگر کبھی انگلستان کو ضرورت پیش آئے کہ وہ اپنے دستور کو تحریری شکل میں مدون کرے تو لامحالہ اسے اپنے غیر تحریری دستور کے مختلف مآخذ سے مواد اکٹھا کر کے اپنے دستور کی دفعات مرتب کرنی پڑیں گی۔ ایسی ہی کچھ صورت اس وقت ہمیں درپیش ہے۔

اسلامی دستور کے مآخذ اسلام کے غیر تحریری دستور کے مآخذ چار ہیں۔

اس کا سب سے پہلا ماخذ قرآن مجید ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کے فرامین موجود ہیں۔ یہ احکام و فرامین انسان کی پوری زندگی کے معاملات پر حاوی ہیں۔ ان میں صرف انفرادی کردار اور سیرت ہی کے بارے میں ہدایات نہیں دی گئی ہیں بلکہ اجتماعی زندگی (Social Life) کے بھی ہر پہلو کی اصلاح و تنظیم کے لیے کچھ اصول اور کچھ قطعی احکام دیئے گئے ہیں، اور اس سلسلے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مسلمان اپنی ریاست کن اصولوں پر اور کن مقاصد کے لیے قائم کریں۔

دوسرا ماخذ سنتِ رسول صلعم ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی ہدایات کو اور اس کے دیئے ہوئے اصولوں کو عرب کی سرزمین میں کس طرح نافذ کیا، کس طرح اسلام کے تخیل کو عمل کا جامہ پہنایا، کس طرح اس تخیل پر ایک سوسائٹی کی تشکیل کی، پھر کس طرح اس سوسائٹی کو منظم کر کے ایک اسٹیٹ کی شکل دی، اور اس اسٹیٹ کے مختلف شعبوں کو کس طرح چلا کر بتایا۔ یہ چیزیں سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہمیں معلوم ہو سکتی ہیں اور انہی کی مدد سے ہم یہ جان سکتے ہیں کہ قرآن کا ٹھیک

(بقیہ حاشیہ ص۱۷۹) ایسی دستاویز ہے جس میں نظم مملکت کے قواعد درج کیے گئے ہوں اور جسے مملکت میں مستقل قانونی حیثیت حاصل ہو۔ جس مملکت کا دستور اس طرح کی کسی دستاویز کی صورت میں لکھا نہ گیا ہو اس کے دستوری قواعد چاہے مختلف مآخذ میں لکھے ہوئے ہی موجود ہوں بہرحال ان کے مجموعے کو غیر تحریری دستور ہی کہا جائے گا۔

ٹھیک منطبق کیا جائے۔ یہ قرآن کے دیے ہوئے اصولوں کا عملی حالات پر انطباق (Application) ہے جس سے ہم کو اسلامی دستور کے لیے نہایت قیمتی نظائر (Precedents) حاصل ہوتے ہیں اور دستوری روایات (Constitutional Traditions) کا بڑا اہم مواد بہم پہنچتا ہے۔

تیسرا ماخذ خلافتِ راشدہ کا تعامل ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اسلامی سٹیٹ کو خلفاء راشدین نے جس طرح چلایا اس کے نظائر اور اس کی روایات سے حدیث، تاریخ اور سیرت کی کتابیں بھری پڑی ہیں اور یہ سب چیزیں ہمارے لیے ایک نمونہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسلام میں یہ اصول شروع سے آج تک مسلم رہا ہے کہ دینی احکام و ہدایات کی جو تعبیریں صحابۂ کرام نے بالاتفاق کی ہیں جسے اصطلاح میں اجماع کہا جاتا ہے اور دستوری و قانونی مسائل کے جو فیصلے خلفائے راشدین نے صحابہ کے مشورے سے کر دیے ہیں وہ ہمارے لیے حجت ہیں، یعنی ان کو جوں کا توں تسلیم کرنا پڑے گا۔ کیونکہ صحابہ کے کسی معاملہ میں متفق ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک مستند تعبیر، قانون اور معتبر طریقِ عمل ہے۔ جہاں ان کے درمیان اختلافات ہوئے ہیں وہاں تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس مسئلے میں دو یا دو سے زیادہ تعبیروں کی گنجائش ہے اور ایسے معاملات میں دلیل سے ایک قول کو دوسرے قول پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ مگر جہاں ان کے درمیان کامل اتفاق ہو گیا ہے وہاں ان کا فیصلہ لازماً ایک ہی تعبیر اور ایک ہی طرزِ عمل کو صحیح و مستند ثابت کر دیتا ہے، کیونکہ یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے براہ راست شاگرد اور تربیت یافتہ تھے اور ان سب کا متفق ہو کر دین کے معاملے میں غلطی کر جانا یا دین کے سمجھنے میں راہِ صواب سے ہٹ جانا قابلِ تسلیم نہیں ہے۔

چوتھا ماخذ مجتہدینِ امت کے وہ فیصلے ہیں جو انہوں نے مختلف دستوری مسائل پیش آنے پر اپنے علم و بصیرت کی روشنی میں کیے ہیں۔ یہ چاہے حجت نہ ہوں، مگر بہرحال اسلامی دستور کی روح اور اس کے اصولوں کو سمجھنے میں ہماری بہترین رہنمائی کرتے ہیں۔

یہ ہیں ہمارے دستور کے چار مآخذ۔ ہم جب کبھی اسلامی حکومت کا دستور تحریری شکل میں لانا چاہیں، ہم کو انہی مآخذ سے اس کے قواعد جمع کر کے مرتب کرنے ہوں گے، بالکل اسی طرح جیسے انگلستان کے لوگ اگر آج اپنا دستور مدون کرنا چاہیں تو انہیں اپنے وضعی قانون (Statute Law)

اور عرفی قانون (Common Law) اور اپنے دستوری رواج (Constitutional Usage) وغیرہ سے ایک ایک جزئیہ اخذ کر کے صفحۂ کاغذ پر ثبت کرنا ہوگا اور بہت سے دستوری احکام و قواعد ان کو اپنی عدالتوں کے فیصلوں سے چن چن کر نکالنے ہونگے۔

مشکلات جہاں تک اسلامی دستور کے ان مآخذ کا تعلق ہے، یہ سب تحریری شکل میں موجود ہیں۔ قرآن لکھا ہوا ہے۔ سنتِ رسول اور تعاملِ خلفائے راشدین کے متعلق سارا مواد کتابوں میں مل سکتا ہے مجتہدینِ امت کی آرا بھی معتبر کتابوں میں مل جاتی ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز بھی نہ مفقود ہے نہ نایاب۔ لیکن اس کے باوجود ان مآخذ سے اس غیر تحریری دستور کے قواعد اخذ کر کے ان کو تحریری دستور کی شکل دینے میں چند مشکلات اور چند دقتیں حائل ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آگے بڑھنے سے پہلے آپ ان کو بھی اچھی طرح سمجھ لیں۔

اصطلاحات کی اجنبیت سب سے پہلی دقت زبان کی ہے۔ قرآن، حدیث اور فقہ میں دستوری احکام کو بیان کرنے کے لیے جو اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں وہ اب بالعموم لوگوں کے لیے ناقابلِ فہم ہو گئی ہیں کیونکہ ایک مدت دراز سے ہمارے ہاں اسلام کا سیاسی نظام معطل ہو چکا ہے اور ان اصطلاحوں کا چلن نہیں رہا ہے۔ قرآن مجید میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کو ہم روزانہ تلاوت کرتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ یہ دستوری اصطلاحات ہیں، مثلاً سلطان، ملک، حکم، امر، ولایت وغیرہ۔ ان الفاظ کے صحیح دستوری مفہوم کو عربی میں بھی کم لوگ سمجھتے ہیں، اور ترجموں میں منتقل ہو کر تو ان کا سارا مطلب خبط ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی قرآن کے دستوری احکام کا ذکر سن کر حیرت کے ساتھ پوچھنے لگتے ہیں کہ قرآن میں کونسی آیت دستور سے تعلق رکھتی ہے۔ فی الواقع ان بیچاروں کی حیرت بجا ہے۔ قرآن میں کوئی سورت "الدستور" کے نام سے نہیں ہے اور نہ بیسویں صدی کی اصطلاحات میں کوئی آیت نازل ہوئی ہے۔

قدیم فقہی لٹریچر کی نامانوس ترتیب دوسری دقت یہ ہے کہ ہمارے فقہی لٹریچر میں دستوری مسائل کہیں الگ ابواب کے تحت یکجا بیان نہیں کیے گئے ہیں بلکہ دستور اور قوانین ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ قانون سے الگ دستور کا جداگانہ تصور بہت بعد کے زمانے کی پیداوار ہے، بلکہ خود لفظ دستور کا استعمال بھی اپنے جدید معنوں میں ابھی حال ہی میں شروع ہوا ہے۔ البتہ ان مسائل پر جنہیں

ہم اب دستوری مسائل کہتے ہیں، تمام فقہائے اسلام نے بحث کی ہے مگر ان کی بحثیں ہم کو فقہی کتابوں کے اندر مختلف قانونی ابواب میں بکھری ہوئی ملتی ہیں۔ ایک مسئلے پر کتاب القضا میں بحث ہے تو دوسرے پر کتاب الامارت میں۔ ایک مسئلہ کتاب السیر (مسائل صلح و جنگ کی کتاب) میں بیان ہوا ہے تو دوسرا کتاب النکاح والطلاق میں۔ ایک مسئلہ کتاب الحدود (فوجداری قانون کی کتاب) میں آیا ہے تو دوسرا کتاب الفئ (پبلک فینانس کی کتاب) میں۔ پھر ان کی زبان اور اصطلاحات آج کل کی رائج اصطلاحوں سے اس قدر مختلف ہیں کہ جب تک کوئی شخص قانون کے مختلف شعبوں اور ان کے مسائل پر کافی بصیرت نہ رکھتا ہو اور پھر عربی زبان سے بھی بخوبی واقف نہ ہو، اس کو یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ کہاں قانون ملکی کے درمیان قانون بین الاقوام کا کوئی مسئلہ آگیا ہے اور کہاں پرسنل لا کے درمیان دستوری قانون کے کسی مسئلے پر روشنی ڈال دی گئی ہے۔

پچھلی صدیوں کے دوران میں ہمارے بہترین قانونی دماغوں نے غایت درجہ بیش قیمت ذخیرہ چھوڑا ہے مگر آج ان کی چھوڑی ہوئی میراث کو چھان پھٹک کر ایک ایک قانونی شعبے کے مواد کو الگ الگ کرنا اور اسے منقح صورت میں سامنے لانا ایک بڑی دیدہ ریزی کا کام ہے جس کے لیے موجودہ نسلیں، جنہوں نے مدتوں سے دوسروں کے پس خوردہ پر قناعت کر لی ہے، مشکل ہی سے آمادہ ہو سکتی ہیں۔ بلکہ ستم یہ ہے کہ آج ہم اپنی اس آبائی میراث کو بے جانے بوجھے حقارت کی نگاہ سے دیکھ رہی ہیں۔

نظامِ تعلیم کا نقص تیسری مشکل یہ ہے کہ ہمارے ہاں تعلیم ایک کافی مدت سے بڑی ناقص ہو رہی ہے۔ جو لوگ ہمارے ہاں علومِ دینی پڑھتے ہیں وہ موجودہ زمانے کے علم السیاست اور اس کے مسائل اور دستوری قانون اور اس سے تعلق رکھنے والے معاملات سے بے گانہ ہیں، اس لیے وہ قرآن و حدیث اور فقہ کے پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے میں تو عمریں گزار دیتے ہیں، مگر ان کے لیے اس وقت کے سیاسی و دستوری مسائل کو آج کل کی زبان اور اصطلاحوں میں سمجھنا اور پھر ان کے بارے میں اسلام کے اصول و احکام کو وضاحت کے ساتھ بیان کرنا سخت مشکل ہوتا ہے۔ وہ اس بات کے محتاج ہیں کہ ان کے سامنے یہ مسائل اُس زبان اور اُن اصطلاحوں میں پیش کیے جائیں جنہیں وہ سمجھتے ہیں، پھر وہ آسانی کے ساتھ بتا سکتے ہیں کہ ان کے بارے میں اسلام کے کیا احکام اور اصول ہیں اور وہ کہاں کہاں بیان ہوئے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے جدید تعلیم یافتہ

لوگ ہیں جو عملاً ہمارے تمدن و سیاست اور قانون و عدالت کا نظام سنبھالے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ زندگی کے جدید مسائل سے تو واقف ہیں، مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ ان کا دین ان مسائل کے بارے میں کیا رہنمائی دیتا ہے۔ وہ دستور اور سیاست اور قانون کے متعلق جو کچھ جانتے ہیں مغربی تعلیمات اور مغرب کے عملی نمونوں ہی کے ذریعہ سے جانتے ہیں۔ قرآن اور سنت اور اسلامی روایات کے بارے میں ان کی معلومات بہت محدود ہیں۔ اس لیے ان میں سے جو لوگ واقعی نیک نیتی کے ساتھ اسلامی نظام زندگی کا از سر نو احیاء چاہتے ہیں وہ بھی اس کے محتاج ہیں کہ کوئی ان مسائل کے بارے میں اسلام کی ہدایات ان کے سامنے اس زبان میں پیش کرے جسے وہ سمجھتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی پیچیدگی ہے جو ایک صحیح اسلامی دستور کی تدوین میں حارج ہو رہی ہے۔

اجتہاد بلا علم کا دعویٰ چوتھی مشکل ایک اور ہے جو اب بڑھتے بڑھتے ایک لطیفے اور مذاق کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ حال میں یہ ایک نرالا انداز فکر پیدا ہوا ہے کہ اسلام میں "پریسٹ ہڈ" نہیں ہے، قرآن اور سنت اور شریعت پر کوئی "ملا" کا اجارہ نہیں ہے کہ بس وہی ان کی تعبیر کرنے کا مجاز ہو، جس طرح وہ تعبیر احکام اور اجتہاد و استنباط کرنے کا حق رکھتا ہے اسی طرح ہم بھی یہی حق رکھتے ہیں، اور کوئی وجہ نہیں کہ دین کے معاملے میں ملا کی بات ہماری بات سے زیادہ وزنی ہو۔ یہ باتیں وہ لوگ کہتے ہیں جو نہ قرآن و سنت کی زبان سے واقف ہیں، نہ اسلامی روایات پر جن کی نگاہ ہے، نہ اپنی زندگی کے چند روز بھی جنہوں نے اسلام کے تحقیقی مطالعے میں صرف کیے ہیں۔ وہ ایمانداری کے ساتھ اپنے علم کا نقص محسوس کرنے اور اسے دور کرنے کے بجائے سرے سے علم کی ضرورت ہی کا انکار کرنے پر تل گئے ہیں اور اس بات پر مصر ہیں کہ انہیں علم کے بغیر اپنی تعبیروں سے اسلام کی صورت بگاڑ دینے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ اگر جہالت کی اس طغیانی کو یونہی بڑھنے دیا گیا تو بعید نہیں کہ کل کوئی اٹھ کر کہے کہ اسلام میں "وکیل ہڈ" نہیں ہے اس لیے ہر شخص قانون پر بولے گا چاہے اس نے قانون کا ایک لفظ نہ پڑھا ہو، اور پرسوں کوئی دوسرے صاحب اٹھیں اور فرمائیں کہ اسلام میں انجینئرنگ ہڈ نہیں ہے اس لیے ہم بھی انجینئرنگ پر کلام کریں گے چاہے ہم اس فن کی الف بے سے بھی واقف نہ ہوں، اور پھر کوئی تیسرے صاحب اسلام میں ڈاکٹر ہڈ کا انکار کر کے مریضوں کا علاج کرنے کھڑے ہو جائیں بغیر اس کے کہ ان کو علم طب کی ہوا بھی لگی ہو۔ میں سخت حیران ہوں کہ اچھے

خاصے پڑھے لکھے اور ذی عزت لوگ یہ کیسی اوچھی اور طفلانہ باتیں کرنے پر اتر آئے ہیں اور کیوں انہوں نے اپنی ساری قوم کو ایسا نادان فرض کر لیا ہے کہ وہ ان کی یہ باتیں سن کر آمنا و صدقنا کہہ دیگی۔ بے شک اسلام میں پریسٹ ہڈ نہیں ہے، مگر انہیں معلوم بھی ہے کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اسلام میں نہ تو بنی اسرائیل کی طرح دین کا علم اور دینی خدمات کسی نسل اور قبیلے کی میراث ہیں، اور نہ عیسائیوں کی طرح دین و دنیا کے درمیان تفریق کی گئی ہے کہ دنیا قیصروں کے حوالے اور دین پادریوں کے حوالے کر دیا گیا ہو۔ بلاشبہ یہاں قرآن اور سنت اور شریعت پر کسی کا اجارہ نہیں ہے اور نہ کسی نسل یا خاندان کا نام نہیں ہے جس کو دین کی تعبیر کرنے کا آبائی حق ملا ہوا ہو۔ جس طرح ہر شخص قانون پڑھ کر وکیل اور جج بن سکتا ہے، اور ہر شخص انجینئرنگ پڑھ کر انجینئر اور طب پڑھ کر ڈاکٹر بن سکتا ہے اسی طرح ہر شخص قرآن اور سنت کے علم پر وقت اور محنت صرف کر کے مسائل شریعت میں کلام کرنے کا مجاز ہو سکتا ہے۔ اسلام میں پریسٹ ہڈ نہ ہونے کا اگر کوئی معقول مطلب ہے تو وہ یہی ہے۔ نہ یہ کہ اسلام کوئی بازیچۂ اطفال بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے کہ جس کا جی چاہے اٹھ کر اس کے احکام اور تعلیمات کے بارے میں ماہرانہ فیصلے صادر کرنے شروع کر دے، خواہ اس نے قرآن اور سنت میں بصیرت پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہ کی ہو۔ علم کے بغیر اتھارٹی بننے کا دعویٰ اگر دنیا کے کسی دوسرے معاملے میں قابل قبول نہیں ہے تو آخر دین ہی کے معاملے میں کیوں قابل قبول ہو؟

یہ چوتھی پیچیدگی ہے جو اسلامی دستور کی تدوین کے معاملے میں اب ڈال دی گئی ہے، اور اس وقت درحقیقت یہی سب سے بڑی پیچیدگی ہے۔ پہلی تین مشکلات کو تو محنت اور کوشش سے رفع کیا جا سکتا تھا اور خدا کے فضل سے ایک حد تک رفع کر بھی دیا گیا ہے۔ لیکن اس نئی الجھن کا علاج سخت مشکل ہے، خصوصاً جبکہ وہ اُن لوگوں کی طرف سے ہو جو بالفعل اقتدار کی کنجیوں پر قابض ہوں۔

دستور کے بنیادی مسائل اب میں دستور کے چند بڑے بڑے اور بنیادی مسائل کو لے کر مختصراً یہ بتاؤں گا کہ اسلام کے اصلی مآخذ میں ان کے متعلق کیا قواعد ہمیں ملتے ہیں۔ اس سے آپ خود یہ اندازہ کر سکیں گے کہ اسلام دستوری مسائل میں کوئی رہنمائی کرتا ہے یا نہیں، اور کرتا ہے تو آیا اس کی نوعیت محض سفارشات کی ہے یا ایسے قطعی احکام کی جنہیں ہم مسلمان ہوتے ہوئے رد نہیں کر سکتے۔ اس سلسلے میں طوالت سے بچنے

کے لیے میں دستور کے صرف ۹ بنیادی مسائل پر گفتگو کروں گا:-

(۱) پہلا سوال یہ ہے کہ حاکمیت کس کی ہے؟ کسی بادشاہ کی؟ یا کسی طبقہ کی؟ یا پوری قوم کی؟ یا خدا کی؟

(۲) دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسٹیٹ کے حدودِ عمل کیا ہیں؟ کس حد تک وہ اطاعت کا مستحق ہے اور کہاں اس کی اطاعت کا حق ساقط ہو جاتا ہے؟

(۳) تیسرا بنیادی سوال دستور کے بارے میں یہ ہے کہ ریاست کے مختلف اعضاء (Organs) یعنی انتظامیہ (Executive) عدلیہ (Judiciary) اور مقننہ (Legislature) کے الگ الگ حدودِ عمل کیا ہیں؟ ان میں سے ہر ایک کیا فریضہ ادا کریگا اور کن حدود کے اندر کرے گا؟

(۴) چوتھا اہم سوال یہ ہے کہ اسٹیٹ کا مقصدِ وجود کیا ہے؟ کس غرض کے لیے اسٹیٹ کام کرے گا اور اس کی پالیسی کے بنیادی اصول کیا ہیں؟

(۵) پانچواں سوال یہ ہے کہ ریاست کے نظام کو چلانے کے لیے حکومت کی تشکیل کیسے کی جائیگی؟

(۶) چھٹا سوال یہ ہے کہ حکومت کے نظام کو چلانے والوں کی صفات (Qualifications) کیا ہونگی؟ کون لوگ اس کو چلانے کے لیے اہل قرار دیے جائیں گے؟

(۷) ساتواں سوال یہ ہے کہ دستور میں شہریت کی بنیادیں کیا ہونگی؟ کیسے کوئی شخص اس ریاست کا شہری قرار پائے گا اور کیسے نہیں؟

(۸) آٹھواں سوال یہ ہے کہ شہریوں کے بنیادی حقوق کیا ہیں؟ اور پھر

(۹) نواں سوال یہ ہے کہ شہریوں پر اسٹیٹ کے حقوق کیا ہیں۔

ہر دستور کے معاملے میں یہ سوالات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، اور ہمیں دیکھنا ہے کہ اسلام ان سوالات کا کیا جواب دیتا ہے

حاکمیت کس کی ہے؟ سب سے پہلے اس سوال کو لیجیے کہ اسلامی ریاست کا دستور "حاکمیت" کا مقام کس کو دیتا ہے؟ اس کا قطعی اور ناطق جواب قرآن سے ہمیں یہ ملتا ہے کہ حاکمیت بر معنی میں اللہ تعالیٰ کی ہے،

اس لیے کہ وہی فی الواقع حاکمِ حقیقی ہے اور اُسی کا یہ حق ہے کہ اس کو حاکمِ اعلیٰ مانا جائے۔ اس مسئلے کو اگر کوئی شخص اچھی طرح سمجھنا چاہے تو میں اسے مشورہ دونگا کہ پہلے وہ "حاکمیت" کے معنی اور تصور کو اچھی طرح ذہن نشین کرلے۔

علمِ سیاست کی اصطلاح میں یہ لفظ اقتدارِ اعلیٰ اور اقتدارِ مطلق کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ کسی شخص یا مجموعۂ اشخاص یا ادارے کے صاحبِ حاکمیت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا حکم قانون ہے۔ اسے افرادِ ریاست پر حکم چلانے کے غیر محدود اختیارات حاصل ہیں، اور افراد اس کی غیر مشروط اطاعت پر مجبور ہیں خواہ بطوع و رغبت یا بکراہت۔ اس کے اختیاراتِ حکمرانی کو اُس کے اپنے ارادے کے سوا کوئی خارجی چیز محدود کرنے والی نہیں ہے۔ افراد کو اس کے مقابلے میں کوئی حق حاصل نہیں۔ جس کے جو کچھ بھی حقوق ہیں اُسی کے دیے ہوئے ہیں اور وہ جس حق کو بھی سلب کرلے وہ آپ سے آپ معدوم ہو جاتا ہے۔ ایک قانونی حق پیدا ہی اس بنا پر ہوتا ہے کہ شارع (law giver) نے اس کو پیدا کیا، اس لیے جب شارع نے اس کو سلب کر لیا تو سرے سے کوئی حق باقی ہی نہیں رہا کہ اس کا مطالبہ کیا جا سکے۔ قانون صاحبِ حاکمیت کے ارادے سے وجود میں آتا ہے اور افراد کو اطاعت کا پابند کرتا ہے، مگر خود صاحبِ حاکمیت کو پابند کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ اپنی ذات میں قادرِ مطلق ہے۔ اس کے احکام کے بارے میں خیر اور شر، صحیح اور غلط کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ جو کچھ وہ کرے وہی خیر ہے، اس کے کسی تابع کو اسے شر قرار دے کر رد کر دینے کا حق نہیں ہے۔ جو کچھ وہ کرے وہ صحیح ہے، کوئی تابع اس کو غلط قرار نہیں دے سکتا۔ اس لیے ناگزیر ہے کہ اسے سبوح و قدوس اور منزہ عن الخطا مانا جائے، قطع نظر اس سے کہ وہ ایسا ہو یا نہ ہو۔

یہ ہے قانونی حاکمیت کا تصور جسے ایک قانون داں (فقیہ یا Jurist) پیش کرتا ہے اور جس سے کم چیز کا نام "حاکمیت" نہیں ہے۔ مگر یہ حاکمیت اُس وقت تک بالکل ایک مفروضہ رہتی ہے جب تک کہ اس کی پشت پر کوئی واقعی حاکمیت (یا علم سیاست کی اصطلاح میں سیاسی حاکمیت Political Sovereignty) نہ ہو، یعنی عملاً اُس اقتدار کی مالک جو اس قانونی

حاکمیت کو مسلط کرے

اب پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی کوئی حاکمیت فی الواقع انسانی دائرے میں موجود بھی ہے؟ اور ہے تو وہ کہاں ہے؟ کس کو اس حاکمیت کا حامل کہا جا سکتا ہے؟ کیا کسی شاہی نظام میں واقعی کوئی بادشاہ ایسی حاکمیت کا حامل ہے یا کبھی پایا گیا ہے یا پایا جا سکتا ہے؟ آپ کسی بڑے سے بڑے مختار مطلق فرمانروا کو لے لیجیے۔ اس کے اقتدار کا آپ تجزیہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس کے اختیارات کو بہت سی خارجی چیزیں محدود کر رہی ہیں جو اس کے ارادے کی تابع نہیں ہیں۔ پھر کیا کسی جمہوری نظام میں کسی خاص جگہ انگلی رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ یہاں واقعی حاکمیت موجود ہے؟ جس کو بھی آپ اس کا حامل قرار دیں گے، تجزیہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس کے ظاہری اختیارِ مطلق کے پیچھے کچھ اور طاقتیں ہیں جن کے ہاتھ میں اس کی باگیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علم سیاست کے ماہرین جب حاکمیت کا واضح تصور لے کر انسانی سوسائٹی کے دائرے میں اس کا واقعی مصداق تلاش کرتے ہیں تو انہیں سخت پریشانی پیش آتی ہے۔ کوئی قامت ایسا نہیں ملتا جس پر یہ جامہ راست آتا ہو۔ اس لیے کہ انسانیت کے دائرے میں، بلکہ درحقیقت مخلوقات کے دائرے میں اس قامت کی کوئی ہستی سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن بار بار کہتا ہے کہ فی الواقع حاکمیت کا حامل صرف ایک خدا ہے۔ وہی مختارِ مطلق ہے (فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ)، وہی غیر مسئول اور غیر جواب دہ ہے (لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ)۔ وہی تمام اقتدار کا مالک ہے (بِيَدِهٖ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ)۔ وہی ایک ایسی ہستی ہے جس کے اختیارات کو محدود کرنے والی کوئی طاقت نہیں ہے (وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ)۔ اور اسی کی ذات منزہ عن الخطا ہے (الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ)۔

پھر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حقیقتِ نفس الامری سے قطع نظر کرتے ہوئے اگر کسی غیر اللہ کو یہ حاکمانہ حیثیت دے بھی دی جائے تو کیا فی الواقع اس کا یہ حق ہے کہ اس کا حکم قانون ہو، اور اس کے مقابلے میں کسی کا کوئی حق نہ ہو اور اس کی غیر مشروط اطاعت کی جائے اور اس کے حکم کے بارے میں خیر و شر یا صحیح و غلط کا سوال نہ اٹھایا جا سکے؟ یہ حق خواہ کسی شخص کو دیا جائے، یا کسی ادارے کو، یا باشندوں کی اکثریت کو، بہرحال یہ پوچھا جائے گا کہ اس کو آخر یہ حق کس بنیاد پر حاصل ہوتا ہے؟ اور اس بات کی دلیل کیا ہے کہ اسے افراد پر اس طرح حاکم ہونے کا حق حاصل ہے؟ اس سوال کا زیادہ سے زیادہ اگر کوئی جواب دیا جا سکتا ہے تو وہ صرف یہ کہ

لوگوں کی رضامندی اس حاکمیت کے برحق ہونے کی دلیل ہے؟ مگر کیا آپ یہ ماننے کے لیے تیار ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی رضامندی سے اپنے آپ کو کسی دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کر دے تو اس خریدار کو اس شخص پر جائز حقِ مالکانہ حاصل ہو جاتا ہے؟ اگر یہ رضامندی اس ملکیت کو برحق نہیں بناتی تو آخر کسی غلط فہمی کی بنا پر محض جمہور کا رضامند ہو جانا کسی حاکمیت کو برحق کیسے بنا سکتا ہے؟ قرآن اس گتھی کو بھی یہ کہہ کر سلجھا دیتا ہے کہ اللہ کی مخلوق پر کسی مخلوق کو بھی حکم چلانے کا حق نہیں ہے، یہ حق صرف اللہ کو حاصل ہے، اور اس بنا پر حاصل ہے کہ وہی اپنی مخلوق کا خالق ہے۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ "خبردار! خلق اسی کی ہے اور امر بھی اسی کے لیے ہے"۔ یہ ایک ایسی معقول بات ہے جسے کم از کم وہ لوگ تو رد نہیں کر سکتے جو خدا کو خالق تسلیم کرتے ہیں۔

پھر تیسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بالفرض حق اور باطل کی بحث کو نظر انداز کر کے حاکمیت کا یہ منصب کسی انسانی اقتدار کو دے بھی دیا جائے تو کیا اس میں انسانیت کی بھلائی ہے؟ انسان، خواہ وہ کوئی ایک شخص ہو، یا کوئی طبقہ یا کسی قوم کا مجموعہ، بہرحال حاکمیت کی اتنی بڑی خوراک ہضم نہیں کر سکتا کہ افراد پر حکم چلانے کے اس کو غیر محدود اختیارات حاصل ہوں اور اس کے مقابلے میں کسی کا کوئی حق نہ ہو اور اس کے فیصلے کو بے خطا مان لیا جائے۔ اس طرح کے اختیارات جب بھی کسی انسانی اقتدار کو حاصل ہوں گے، ظلم ضرور ہوگا۔ معاشرے کے اندر بھی ظلم ہوگا اور معاشرے کے باہر دوسرے ہمسایہ معاشروں پر بھی ہوگا۔ فساد اس بندوبست کی فطرت میں مضمر ہے اور جب کبھی انسانوں نے زندگی کا یہ ہنجار اختیار کیا ہے فساد رونما ہوئے بغیر نہیں رہا ہے۔ اس لیے کہ جس کی فی الواقع حاکمیت نہیں ہے، اور جس کو حاکمیت کا حق بھی حاصل نہیں ہے اسے اگر مصنوعی طور پر حاکمیت کا مقام حاصل ہو جائے تو وہ اس منصب کے اختیارات کبھی صحیح طریقے سے استعمال نہیں کر سکتا۔ یہی بات ہے جسے قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ "جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی ظالم ہیں"۔

اِن وجوہ سے اسلام میں یہ قطعی طور پر طے کر دیا گیا ہے کہ قانونی حاکمیت اُسی خدا کی مانی جائے جس کی واقعی حاکمیت ساری کائنات پر قائم ہے اور جسے انسانوں پر بھی حاکمیت کا لاشریک حق حاصل ہے۔

اس بات کو قرآن میں اتنی بار بیان کیا گیا ہے کہ اس کا شمار مشکل ہے اور اتنے زور کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اس سے زیادہ پُرزور الفاظ کسی بات کو بیان کرنے کے لیے ہو نہیں سکتے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ فرمایا:۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔

حکم اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں، اس کا فرمان ہے کہ خود اُس کے سوا تم کسی کی بندگی و اطاعت نہ کرو، یہی صحیح طریقہ ہے

دوسری جگہ فرمایا:۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ۔

پیروی کرو اس قانون کی جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اور اسے چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔

تیسری جگہ خدا کی اس قانونی حاکمیت سے انحراف کرنے کو صریح کفر سے تعبیر کیا گیا ہے:۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔

اور جو اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی کافر ہیں۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی قانونی حاکمیت تسلیم کرنے ہی کا نام ایمان و اسلام ہے اور اس سے انکار قطعی کفر ہے۔

دنیا میں اللہ کی اس قانونی حاکمیت کے نمائندے انبیاء علیہم السلام ہیں یعنی جس ذریعے سے ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے شارع (Legal Sovereign) کا ہمارے لیے کیا حکم اور کیا قانون ہے، وہ ذریعہ انبیاء ہیں اور اسی بنا پر اسلام میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت اُن کی بے چون و چرا اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن میں آپ دیکھیں گے کہ خدا کی طرف سے جو نبی بھی آیا ہے اس نے یہی اعلان کیا ہے کہ اِتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ "اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو" اور قرآن اس بات کو بطور ایک قطعی اصول کے بیان کرتا ہے کہ

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔

ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ — اور جو رسول کی اطاعت کرے اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی

حتیٰ کہ قرآن کسی ایسے شخص کو مسلمان ماننے سے انکار کرتا ہے جو اختلافی امور میں رسول کو آخری فیصلہ دینے والی اتھارٹی تسلیم نہ کرے :-

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۔

پس نہیں، تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہونگے جبتک کہ اپنے اختلاف میں تجھے فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو فیصلہ تو کرے اس پر اپنے دل میں کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔

پھر وہ کہتا ہے کہ :-

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۔

اور کسی مومن مرد اور عورت کو یہ حق ہی نہیں ہے کہ اللہ اور رسول جب کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو ان کے لیے پھر خود اپنے معاملے میں فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہ جائے، اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔

اس کے بعد یہ شبہ کرنے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی کہ اسلام میں قانونی حاکمیت خالصتہً اللہ اور کلیتہً اللہ اور اس کے رسول کی ہے۔ اس اہم ترین دستوری مسئلے کا فیصلہ ہو جانے کے بعد یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ پھر سیاسی حاکمیت (Political Sovereignty) کس کی ہے؟ اس کا جواب لامحالہ یہی ہے اور یہی ہو سکتا ہے کہ وہ بھی اللہ کی ہے، کیونکہ انسانوں میں جو ایجنسی بھی سیاسی طاقت سے اللہ تعالیٰ کی قانون حاکمیت کو نافذ (enforce,) کرنے کے لیے قائم ہو گی اس کو کسی طرح بھی قانون اور سیاست کی اصطلاح میں صاحب حاکمیت (Sovereign) نہیں کہا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ جو طاقت قانونی حاکمیت نہ رکھتی ہو، اور جس کے اختیارات کو پہلے ہی ایک بالاتر قانون نے محدود اور پابند کر دیا ہو جسے بدلنے کا اسے اختیار نہ ہو، وہ حاکمیت کی حامل تو نہیں ہو سکتی۔ اب اس کی صحیح پوزیشن

کس لفظ سے ادا کی جائے؟ اس سوال کو قرآن ہی نے حل کر دیا ہے۔ وہ اسے لفظ خلافت سے تعبیر کرتا ہے یعنی وہ بجائے خود حاکمِ اعلیٰ نہیں ہے بلکہ حاکمِ اعلیٰ کی نائب ہے۔

اِس نیابت کے لفظ سے آپ کا ذہن ظل اللہ، اور پاپائیت اور Divine Rights of Kings, کی طرف منتقل نہ ہو جائے۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ اللہ کی نیابت کا یہ مقام کسی فردِ واحد یا کسی خاندان، یا کسی مخصوص طبقے کا حق نہیں ہے بلکہ تمام اُن لوگوں کا حق ہے جو اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کریں اور رسول کے ذریعے سے پہنچے ہوئے قانونِ الٰہی کو بالاتر قانون مان لیں:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ۔ اللہ نے وعدہ کیا ہے اُن لوگوں سے جنہوں نے تم میں سے ایمان قبول کیا اور عملِ صالح کیا کہ وہ ان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنائیگا

یہ چیز اسلامی خلافت کو قیصریت اور پاپائیت اور مغربی تصور والی مذہبی ریاست Theocracy, کے برعکس ایک جمہوریت بنا دیتی ہے، اِس فرق کے ساتھ کہ اہلِ مغرب جس چیز کو لفظِ جمہوریت سے تعبیر کرتے ہیں اس میں جمہور کو حاکمیت کا حامل قرار دیا جاتا ہے، اور ہم مسلمان جسے جمہوریت کہتے ہیں اس میں جمہور صرف خلافت کے حامل ٹھیرائے جاتے ہیں۔ ریاست کے نظام کو چلانے کے لیے اُن کی جمہوریت میں بھی عام رائے دہندوں کی رائے سے حکومت بنتی اور بدلتی ہے اور ہماری جمہوریت بھی اسی کی متقاضی ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ ان کے تصور کے مطابق جمہوری ریاست مطلق العنان اور مختار مطلق ہے اور ہمارے تصور کے مطابق جمہوری خلافت اللہ کے قانون کی پابند۔

ریاست کے حدودِ عمل خلافت کی اس تشریح سے یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے کہ اسلامی دستور میں ریاست کے حدودِ عمل کیا ہیں۔ جب یہ ریاست اللہ کی خلافت ہے اور اللہ کی قانونی حاکمیت تسلیم کرتی ہے تو لامحالہ اس کا دائرۂ اختیار اُن حدود کے اندر ہی محدود رہے گا جو اللہ نے مقرر کی ہیں۔ ریاست جو کچھ کر سکتی ہے ان حدود کے اندر ہی کر سکتی ہے، ان سے تجاوز کرنے کی وہ از روئے دستور مجاز نہیں ہے۔ یہ بات صرف منطقی طور پر ہی خدا کی قانونی حاکمیت کے اصول سے نہیں نکلتی بلکہ قرآن خود اس کو صاف صاف بیان کرتا ہے۔ وہ جگہ جگہ احکام دے کر متنبہ کرتا ہے تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا

"یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں، اِن کے پاس نہ پھٹکو" "تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا" "یہ اللہ کی حدود ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو" "وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ" "اور جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کریں وہی ظالم ہیں" پھر وہ بطور ایک قاعدہ کلیہ کے یہ حکم دیتا ہے کہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ اور آخرت کے دن پر۔

اس آیت کی رو سے ریاست کی اطاعت لازماً خدا اور رسول کی اطاعت کے تحت ہے نہ کہ اس سے آزاد، اور اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ احکام خدا و رسول کی پابندی سے آزاد ہو کر ریاست کو سرے سے اطاعت کے مطالبے کا حق ہی باقی نہیں رہتا۔ اسی نکتے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں واضح فرمایا ہے کہ لَا طَاعَةَ لِمَنْ عَصَى اللّٰهَ "کوئی اطاعت اس شخص کے لیے نہیں ہے جو اللہ کی نافرمانی کرے"۔ اور لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق "خالق کی معصیت میں کسی مخلوق کے لیے اطاعت نہیں ہے"۔ اِس اصول کے ساتھ دوسرا اصول جو یہ آیت مقرر کرتی ہے، یہ ہے کہ مسلم سوسائٹی میں جو اختلاف بھی رونما ہو، خواہ وہ افراد اور افراد کے درمیان ہو، یا گروہوں اور گروہوں کے درمیان، یا رعیت اور ریاست کے درمیان، یا ریاست کے مختلف شعبوں اور اجزاء کے درمیان، بہر حال اس کا فیصلہ کرنے کے لیے رجوع اُس بنیادی قانون ہی کی طرف کیا جائے گا جو اللہ اور اس کے رسول نے ہم کو دیا ہے۔ یہ اصول اپنی عین نوعیت ہی کے اعتبار سے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ریاست میں لازماً کوئی ادارہ ایسا ہونا چاہیے جو اختلافی معاملات کا فیصلہ کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کے مطابق کرے۔

اعضائے ریاست کے حدود عمل | یہیں سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ ریاست کے مختلف اعضاء (Organs of the State) کے اختیارات اور حدود عمل کیا ہیں۔

مجالسِ قانون ساز کے حدود | مقننہ (Legislature) وہی چیز ہے جسے ہمارے ہاں کی قدیم اصطلاح میں "اہل الحل والعقد" کہا جاتا ہے۔ اس کے معاملہ میں یہ بات بالکل صاف ہے کہ جو ریاست اللہ اور رسول کی قانونی حاکمیت مان کر بنائی گئی ہو، اس کی مقننہ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کی ہدایات کے خلاف اپنے اجماع سے بھی کوئی قانون سازی کرنے کی مجاز نہیں ہو سکتی۔ ابھی میں آپ کو قرآن کا یہ فیصلہ سنا چکا ہوں کہ "کسی مومن مرد اور عورت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اللہ اور رسول جس معاملے کا فیصلہ کر چکے ہوں اس میں ان کو پھر خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے" اور "جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں" ان احکام کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اللہ اور رسول کے احکام کے خلاف کوئی قانون سازی کرنا مجلسِ قانون ساز کے حدودِ اختیار سے باہر ہو، اور ہر ایسا قانون، اگر وہ لیجسلیچر پاس بھی کر دے، لازماً حدودِ دستور سے متجاوز (Ultra vires of the Constitution) قرار پائے۔

اس سلسلہ میں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ پھر اسلامی ریاست میں مقننہ کا کام ہی کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں مقننہ کے کئی کام ہیں:-

(۱) جن معاملات میں اللہ اور رسول کے واضح اور قطعی احکام موجود ہیں، ان میں اگرچہ مقننہ کوئی رد و بدل نہیں کر سکتی، مگر یہ کام مقننہ ہی کا ہے کہ ان کے نفاذ کے لیے ضروری قواعد و ضوابط Rules and Regulations مقرر کرے۔

(۲) جن معاملات میں کتاب و سنت کے احکام ایک سے زیادہ تعبیرات کے محتمل ہوں، ان میں مقننہ ہی یہ طے کرے گی کہ کونسی تعبیر کو قانونی شکل دی جائے۔ اس غرض کے لیے ناگزیر ہے کہ مقننہ ایسے اہلِ علم پر مشتمل ہو جو تعبیرِ احکام کی اہلیت رکھتے ہوں، ورنہ ان کے غلط فیصلے شریعت کو مسخ کر ڈالیں گے۔ لیکن یہ سوال رائے دہندوں کی صلاحیتِ انتخاب سے تعلق رکھتا ہے۔ اصولاً یہ ماننا پڑے گا کہ قانون سازی کی اغراض کے لیے مقننہ ہی مختلف تعبیرات میں سے ایک کو ترجیح دینے کی مجاز ہے اور اسی کی تعبیر قانون بنے گی بشرطیکہ وہ تعبیر کی حد سے گزر کر تحریف کی حد تک نہ پہنچ جائے۔

(۳) جن معاملات میں احکام موجود نہ ہوں ان میں مقننہ کا کام یہ ہے کہ اسلام کے اصولِ عامہ کو پیشِ نظر

رکھ کر نئے قوانین وضع کرے، یا اگر ان کے بارے میں پہلے سے مدوّن کیے ہوئے قوانین کتب فقہ میں موجود ہوں تو ان میں سے کسی ایک کو اختیار کر لے۔

(۴) جن معاملات میں کوئی اصولی رہنمائی بھی نہ ملتی ہو ان میں یہ سمجھا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں قانون سازی میں آزاد چھوڑ دیا ہے، اس لیے ایسے معاملات میں مقننہ ہر طرح کے مناسب قوانین بنا سکتی ہے، بشرطیکہ وہ کسی شرعی حکم یا اصول سے متصادم نہ ہوتے ہوں۔ اس معاملے میں اصول یہ ہے کہ جو کچھ ممنوع نہیں ہے وہ مباح ہے۔

یہ چاروں قاعدے ہم کو سنت رسول اور تعامل خلفائے راشدین اور مجتہدین امت کی آراء سے معلوم ہوتے ہیں، اور اگر ضرورت ہو تو میں ان میں سے ہر ایک کا ماخذ بتا سکتا ہوں۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ جو شخص اسلامی ریاست کے بنیادی اصول سمجھ لے اُسے خود عقلِ عام (Commonsense) بھی یہ بتا سکتی ہے کہ اس طرز کی ریاست میں مقننہ کے یہی حدودِ عمل ہونے چاہئیں۔

انتظامیہ کے حدودِ عمل اب انتظامیہ کو لیجیے۔ ایک اسلامی ریاست میں انتظامیہ (Executive) کا اصل کام احکامِ الٰہی کو نافذ کرنا اور ان کے نفاذ کے لیے ملک اور معاشرے میں مناسب حالات پیدا کرنا ہے۔ یہی امتیازی خصوصیت اس کو ایک غیر مسلم ریاست کی انتظامیہ سے ممیز کرتی ہے، ورنہ ایک کافر حکومت اور مسلم حکومت میں کوئی فرق باقی ہی نہیں رہتا۔ انتظامیہ وہی چیز ہے جسے قرآن میں "اولی الامر" اور حدیث میں "اُمراء" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اور قرآن و حدیث، دونوں میں ان کے لیے سمع و طاعت (Obedience) کا جو حکم دیا گیا ہے وہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ احکامِ خدا و رسول کے تابع رہیں، ان سے آزاد ہو کر معصیت اور بدعت اور احداث فی الدین کی راہ پر نہ چل پڑیں۔ قرآن اس باب میں صاف کہتا ہے کہ:۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔

اور کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کر جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہو اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہو اور جس کا امر حد سے متجاوز ہو

وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۔

اور اُن حد سے گزر جانے والوں کے امر کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں، اصلاح نہیں کرتے۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ اس معاملے کو یوں بیان فرماتے ہیں:۔

إن امر عليكم عبد مجدع يقودكم بكتاب الله فاسمعوا واطيعوا

اگر تم پر کوئی نکٹا غلام بھی امیر بنا دیا جائے جو کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے تو اسکی سنو اور اطاعت کرو۔

السمع والطاعة على المرء المسلم فى ما احب وكره مالم يؤمر بمعصية فاذا امر بمعصية فلا سمع ولا طاعة

ایک مرد مسلمان پر سمع و طاعت لازم ہے خواہ برضا و رغبت خواہ بکراہت، تاوقتیکہ اس کو معصیت کا حکم نہ دیا جائے پھر اگر معصیت کا حکم دیا جائے تو نہ سمع ہے نہ طاعت۔

لا طاعة فى معصية انما الطاعة فى المعروف۔

معصیت میں کوئی طاعت نہیں ہے۔ طاعت صرف معروف میں ہے۔

من احدث فى امرنا هذا ما ليس منه فهو رد۔

جس نے ہمارے اس کام (یعنی اسلامی نظام زندگی) میں کوئی ایسی نئی بات نکالی جو اس کے مزاج سے بیگانہ ہو تو وہ مردود ہے

من وقر صاحب بدعة فقد اعان على هدم الاسلام

جس نے کسی صاحب بدعت (یعنی اسلامی زندگی میں غیر اسلامی طریقے رائج کرنے والے) کی توقیر کی اس نے اسلام کو منہدم کرنے میں مدد دی۔

ان توضیحات کے بعد اس معاملے میں کوئی اشتباہ باقی نہیں رہ جاتا کہ اسلام میں انتظامی حکومت اور اس کے نظم و نسق کے لیے کیا حدود عمل مقرر کیے گئے ہیں۔

عدلیہ کے حدود عمل | رہی عدلیہ (Judiciary)، جو ہماری قدیم اصطلاح "قضاء" کی ہم معنی ہے، تو اس کا دائرہ عمل بھی خدا کی قانونی حاکمیت کا اصول آپ سے آپ معین کر دیتا ہے۔ اسلام جب کبھی اپنے اصولوں پر ریاست قائم کرتا ہے، اس کے اولین جج خود انبیاء ہوتے ہیں، اور ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے معاملات کا فیصلہ قانونِ الٰہی کے مطابق کریں۔ پھر جو لوگ انبیاء کے بعد اس کرسی پر

بیٹھیں ان کے لیے بھی اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے کہ اپنے فیصلوں کی بنیاد اس قانون پر رکھیں جو اللہ اور اس کے رسول سے ان کو ملا ہے۔ قرآن مجید میں سورۂ مائدہ کے دو رکوع خاص اسی موضوع پر ہیں۔ اُن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے توراۃ نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی، اور بنی اسرائیل کے سارے نبی، اور پھر ربانی اور احبار اسی کے مطابق یہودیوں کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے۔ پھر ہم نے ان کے بعد عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا اور ان کو انجیل عطا کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔ اہلِ انجیل کو چاہیے کہ وہ بھی اس ہدایت پر فیصلے کریں جو اللہ نے انجیل میں نازل کی ہے۔ اس تاریخ کو بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرماتا ہے کہ ہم نے یہ کتاب (قرآن) تمہاری طرف ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ نازل کی ہے۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۔

پس تم لوگوں کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے کرو اور اس حق کو چھوڑ کر جو تمہارے پاس آیا ہے، لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔

آگے چل کر اللہ تعالیٰ اس تقریر کو اس فقرے پر ختم فرماتا ہے کہ

أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ۔

پھر کیا لوگ جاہلیت کے فیصلے چاہتے ہیں؟ یقین رکھنے والوں کے لیے اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟

اس تقریر کے دوران میں اللہ تعالیٰ تین مرتبہ فرماتا ہے کہ جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون پر فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں، وہی ظالم ہیں، وہی فاسق ہیں۔ اس کے بعد شاید یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ ایک اسلامی ریاست کی عدالتیں قانونِ الٰہی کو نافذ کرنے کے لیے بنتی ہیں نہ کہ اس کے خلاف فیصلے کرنے کے لیے۔

مختلف اعضائے ریاست کا باہمی تعلق اس سلسلے میں یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اسلام میں ریاست کے ان تینوں اعضاء کا باہمی تعلق کیا ہے؟ اس باب میں احکام تو موجود نہیں ہیں، مگر عہدِ نبوی اور عہدِ خلافتِ راشدہ کے تعامل (Conventions) میں ہم کو پوری روشنی ملتی ہے۔ اس تعامل سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک صدرِ ریاست کا تعلق ہے، وہ صدر ہونے کی حیثیت سے ریاست کے ان تینوں

شعبوں کا صدر ہے۔ یہی حیثیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھی، اور یہی خلفائے راشدین کو حاصل رہی۔ مگر صدر سے نیچے اتر کر ہم تینوں شعبوں کو اُس دَور میں ایک دوسرے سے الگ پاتے ہیں۔ اُس زمانے میں اہل الحل والعقد الگ تھے، جن کے مشورے سے خلافتِ راشدہ کے دَور میں انتظامی معاملات بھی چلائے جاتے تھے اور قانونی مسائل کے فیصلے بھی کیے جاتے تھے۔ نظم ونسق کے ذمہ دار امراء الگ تھے جن کا قضاء (عدالت) میں کوئی دخل نہ تھا۔ اور قاضی (جج اور مجسٹریٹ) الگ تھے جن پر انتظامی ذمہ داریوں کا کوئی بار نہ تھا۔

مملکت کے اہم معاملات میں پالیسی بنانے، یا انتظامی اور قانونی مسائل کو حل کرنے کی جب کبھی ضرورت پیش آتی، خلفائے راشدین ہمیشہ اہل الحل والعقد کو بلا کر مشورہ کرتے تھے، اور مشورے سے جب کوئی فیصلہ ہو جاتا، تو اہل الحل والعقد کا کام ختم ہو جاتا۔

انتظامی عہدہ دار خلیفہ کے ماتحت تھے، وہی ان کو مقرر کرتا تھا اور اسی کے احکام کے مطابق وہ نظم ونسق چلاتے تھے۔

قاضیوں کا تقرر بھی اگرچہ خلیفہ کرتا تھا، مگر ایک مرتبہ قاضی مقرر ہو جانے کے بعد پھر خلیفہ کو بھی یہ حق نہ تھا کہ ان کے فیصلوں پر اثر انداز ہو۔ بلکہ اپنی ذاتی حیثیت میں، یا منتظمہ کے صدر ہونے کی حیثیت میں، اگر کسی شخص کا ان کے خلاف کوئی دعویٰ ہوتا تھا، تو ان کو بھی قاضیوں کے سامنے ٹھیک اسی طرح جوابدہی کرنی ہوتی تھی جس طرح رعیت کے کسی معمولی فرد کو کرنی ہوتی تھی۔

اُس زمانے میں ہم کو ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کوئی ایک شخص بیک وقت کسی علاقے کا عامل بھی ہو اور قاضی بھی۔ یا کوئی عامل یا گورنر، یا خود صدر ریاست کسی قاضی کے عدالتی فیصلوں میں دخل دینے کا مجاز ہو۔ یا کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی دیوانی وفوجداری دعووں کی جواب دہی سے یا عدالتوں کی حاضری سے مستثنیٰ ہو۔

اس نقشے کی تفصیلات میں ہم اپنی موجودہ ضرورتوں کے مطابق ردوبدل کر سکتے ہیں، مگر اس کے اصول جوں کے توں قائم رہنے چاہئیں۔ جس قسم کے جزوی ردوبدل اس میں کیے جا سکتے ہیں وہ اس طرح کے ہیں کہ مثلاً ہم صدر ریاست کے انتظامی وعدالتی اختیارات خلفائے راشدین کی بہ نسبت محدود کر سکتے ہیں، کیونکہ اب اُس درجے کے قابلِ اعتماد صدر ریاست ہمیں نہیں مل سکتے جیسے خلفاء راشدین تھے۔ اس لیے ہم اپنے

صدر کے انتظامی اختیارات پر بھی پابندیاں عائد کر سکتے ہیں تاکہ وہ ڈکٹیٹر نہ بن جائے، اور اس کو مقدمات کی براہِ راست خود سماعت کرنے اور ان کے فیصلے کرنے سے بھی روک سکتے ہیں تاکہ وہ بے انصافی نہ کرنے لگے۔

(اس موقع پر ایک صاحب نے اٹھ کر سوال کیا کہ آپ کی اس رائے کا ماخذ کیا ہے؟ مقرر نے اس کے جواب میں کہا اِس قول کے لیے میری دلیل یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ میں انتظامیہ اور عدلیہ کے شعبے بالکل الگ الگ تھے۔ رہا صدرِ ریاست تو اس کی ذات میں ان دونوں اختیارات کو کسی حکم شرعی کی بنا پر جمع نہیں رکھا گیا تھا، بلکہ اس اعتماد پر جمع کیا گیا تھا کہ وہ جج کی حیثیت سے انصاف کی مسند پر بیٹھ کر اپنی انتظامی مصلحتوں کو دخیل نہ ہونے دینگے۔ بلکہ خلفائے راشدین کی ذات پر تو لوگوں کو اس درجہ اعتماد تھا کہ وہ خود یہ چاہتے تھے کہ آخری عدالتِ انصاف وہی ہوں تاکہ اگر کہیں انصاف نہ ملے تو ان کے پاس ضرور مل جائے۔ اس اعتماد کی مستحق اگر کوئی شخصیت ہم نہ پاسکیں تو اسلامی دستور کے کسی قاعدے نے ہمیں اس بات پر مجبور نہیں کر دیا ہے کہ ہم صدر کی ذات میں چیف جسٹس اور انتظامیہ کے رئیسِ اعلیٰ کی حیثیتیں لازماً جمع رکھیں)۔

اسی طرح اس نقشے میں جو تبدیلیاں ہم کر سکتے ہیں وہ یہ ہیں کہ مثلاً ہم اہل الحل والعقد کے انتخاب کے طریقے اور ان کی مجلس کے ضابطے حسبِ ضرورت بنا سکتے ہیں۔ ہم عدالتوں کے مختلف درجے مخصوص اختیارات حدودِ سماعت اور حدودِ عمل کے ساتھ مقرر کر سکتے ہیں۔ وغیر ذالک۔

یہاں دو سوالات اور پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب دینے کی ضرورت ہے۔ اول یہ کہ آیا اسلام میں اس امر کی گنجائش ہے کہ قضاء (عدلیہ) اہل الحل والعقد کے طے کیے ہوئے کسی قانونی مسئلے کو خلافِ کتاب و سنت ہونے کی بنا پر رد کر دے؟ اس باب میں کوئی حکم میرے علم میں نہیں ہے۔ خلافتِ راشدہ کا تعامل بے شک یہی تھا کہ قضاء کو یہ اختیارات حاصل نہیں تھے۔ کم از کم اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی قاضی نے ایسا کیا ہو۔ مگر اس کی وجہ میرے نزدیک یہ تھی کہ اُس وقت اہل الحل والعقد کتاب و سنت میں گہری بصیرت رکھنے والے لوگ تھے، اور سب سے بڑھ کر خود خلفائے راشدین اس معاملے میں قابلِ اعتماد تھے کہ ان کی صدارت میں کوئی مسئلہ خلافِ کتاب و سنت طے نہ ہو سکتا تھا۔ آج اگر ہم اپنے دستور میں اس امر کا کوئی قابلِ اطمینان

انتظام کر سکیں کہ کسی مجلس قانون ساز سے کوئی قانون خلافِ کتاب وسنت پاس نہ ہو سکے، تو عدلیہ کو مقننہ کے فیصلوں کا پابند کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر اس کا کوئی قابلِ اطمینان انتظام نہ کیا جا سکے تو پھر آخری چارۂ کار یہی ہے کہ عدلیہ کو خلافِ کتاب وسنت قوانین کے رد کرنے کا اختیار دیا جائے۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام میں مقننہ (اہل الحل والعقد) کی صحیح حیثیت کیا ہے؟ کیا وہ محض صدرِ ریاست کی مشیر ہے جس کے مشوروں کو رد یا قبول کرنے کا صدرِ ریاست کو اختیار ہے؟ یا صدرِ ریاست اس کی اکثریت یا اُس کے اجماع کے فیصلوں کا پابند ہے؟ اس باب میں قرآن جو کچھ کہتا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی معاملات باہمی مشورے سے انجام پانے چاہئیں (وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ)، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت صدرِ ریاست کے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ — اور ان سے معاملات میں مشورہ کرو، پھر (مشورے کے بعد) جب تم عزم کر لو تو اللہ کے بھروسے پر عمل کرو۔

یہ دونوں آیتیں مشورے کو لازم کرتی ہیں، اور صدرِ ریاست کو ہدایت کرتی ہیں کہ جب وہ مشورے کے بعد کسی فیصلے پر پہنچ جائے تو اللہ کے بھروسے پر اسے نافذ کرے۔ لیکن یہ اُس سوال کا کوئی واضح جواب نہیں دیتیں جو ہمارے سامنے پیش ہے۔ حدیث میں بھی اس کے متعلق کوئی قطعی حکم مجھے نہیں ملا ہے۔ البتہ خلافتِ راشدہ کے تعامل سے علماءِ اسلام نے بالعموم یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ نظمِ ریاست کا اصل ذمہ دار صدرِ ریاست ہے اور وہ اہل الحل والعقد سے مشورہ کرنے کا پابند ضرور ہے مگر اس بات کا پابند نہیں ہے کہ ان کی اکثریت یا ان کی متفقہ رائے پر ہی عمل کرے۔ دوسرے الفاظ میں اس کو "ویٹو" کے اختیارات حاصل ہیں۔

لیکن یہ رائے اِس مجمل صورت میں بڑی غلط فہمیوں کی موجب ہوتی ہے، کیونکہ اسے لوگ موجودہ ماحول میں رکھ کر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ ماحول اُن کے سامنے نہیں ہوتا جس کے تعامل سے یہ رائے اخذ کی گئی ہے۔ خلافتِ راشدہ کے ماحول میں جن لوگوں کو اہل الحل والعقد قرار دیا گیا تھا وہ جدا جدا پارٹیوں کی شکل میں منظم نہ تھے۔ وہ اُن پارلیمنٹری ضابطوں سے بھی کسے ہوئے نہ تھے جن سے موجودہ

زمانے کی مجالس قانون ساز کسی ہوتی ہیں۔ وہ مجلس شوریٰ میں پہلے سے الگ الگ اپنی کچھ پالیسیاں وضع کر کے، پروگرام بنا کر، اور پارٹی میٹنگس میں فیصلے کر کے بھی نہیں آتے تھے۔ انہیں جب مشورے کے لیے بلایا جاتا تو وہ کھلے دل کے ساتھ آکر بیٹھتے، خلیفہ خود ان کی مجلس میں موجود ہوتا، مسئلہ پیش کیا جاتا، مخالف اور موافق ہر پہلو پر آزادانہ بحث ہوتی، پھر دونوں طرف کے دلائل کا موازنہ کر کے خلیفہ اپنے دلائل کے ساتھ اپنی رائے بیان کرتا۔ یہ رائے بالعموم ایسی ہوتی تھی کہ پوری مجلس اسے تسلیم کر لیتی تھی کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ چند لوگ اس سے متفق نہ ہوتے تھے، مگر اسے بالکل غلط اور ناقابلِ تسلیم نہیں بلکہ صرف مرجوح سمجھتے تھے اور فیصلہ ہو جانے کے بعد کم از کم عمل کے لیے اُسی کو مان لیتے تھے۔ پوری خلافتِ راشدہ کی تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ اہل الحل والعقد کی مجلس میں ایسی تفریق رونما ہوئی ہو کہ رائے شماری کی نوبت آئے۔ اور پوری خلافتِ راشدہ کی تاریخ میں صرف دو مثالیں اس امر کی ملتی ہیں کہ خلیفۂ وقت نے اہل الحل والعقد کی قریب قریب متفقہ رائے کے خلاف کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک جیشِ اُسامہ کا معاملہ۔ دوسرے مرتدین کے خلاف جہاد کا معاملہ۔ لیکن ان دونوں معاملات میں صحابہ نے جس بنا پر خلیفہ کے فیصلے کو مانا وہ یہ نہیں تھی کہ دستورِ اسلامی نے خلیفہ کو ویٹو کے اختیارات دے رکھے ہیں اور دستوری طور پر وہ بادلِ ناخواستہ اس کا فیصلہ ماننے کے لیے مجبور ہیں، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ صحابۂ کرام کو حضرت ابوبکرؓ کے فہم و فراست اور دینی بصیرت پر پورا اعتماد تھا۔ انہوں نے جب دیکھا کہ ابوبکرؓ اس رائے کی صحت پر اتنا یقین رکھتے ہیں اور دینی مصالح کے لیے اس کو اتنی زیادہ اہمیت دے رہے ہیں، تو انہوں نے کھلے دل سے ان کی رائے کے مقابلے میں اپنی رائے واپس لے لی۔ بلکہ بعد میں ان کی اصابتِ رائے کو کھلم کھلا سراہا اور اعتراف کیا کہ اگر ان مواقع پر ابوبکرؓ استقامت نہ دکھاتے تو اسلام ہی کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ مرتدین کے معاملے میں حضرت عمرؓ نے، جو سب سے بڑھ کر حضرت ابوبکرؓ کی رائے سے اختلاف کر چکے تھے، علی الاعلان کہا کہ اللہ نے ابوبکرؓ کا سینہ اس کام کے لیے کھول دیا اور مجھے معلوم ہو گیا کہ حق وہی ہے جس کا فیصلہ انہوں نے کیا ہے۔

اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسلام میں ویٹو کا یہ تصور دراصل کس ماحول کی نظیروں سے پیدا ہوا ہے۔ اگر شوریٰ کا طرز اور اس کی روح اور اہلِ شوریٰ کی ذہنیت اور سیرت وہی ہو جو خلافتِ راشدہ

کے اس نمونے میں ہم دیکھتے ہیں تو پھر اُس سے بہتر کوئی طریق کار نہیں ہے جو وہاں اختیار کیا گیا۔ اس طریق کار کو اگر ہم اس کے آخری منطقی نتائج تک لے جائیں تو زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس طرز کی مجلس شوریٰ میں اگر صدرِ ریاست اور ارکانِ مجلس اپنی اپنی رائے پر اڑ جائیں اور ان میں سے کوئی دوسرے کے مقابلے میں اپنی رائے واپس نہ لے تو استصوابِ عام (Referendum) کرا لیا جائے، پھر جس کی رائے کو بھی رائے عام رد کر دے وہ مستعفی ہو جائے لیکن جب تک ہمارے لیے اپنے ملک میں اُس روح اور اُس ذہنیت اور اُس طرز کی مجلس شوریٰ بنانا ممکن نہیں ہے، اس کے سوا چارہ نہیں کہ ہم تنظیم کو مقننہ کی اکثریت کے فیصلوں کا پابند کر دیں۔

ریاست کا مقصدِ وجود | اب اس مسئلے کو لیجیے کہ اسلام وہ کونسے بنیادی مقاصد (Objectives) پیش کرتا ہے جن کے لیے ایک اسلامی ریاست کو کام کرنا چاہیے۔ قرآن مجید اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ان مقاصد کی جو توضیح کی گئی ہے وہ یہ ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ

ہم نے اپنے رسول روشن دلائل کے ساتھ بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ

(یہ مسلمان جن کو جنگ کی اجازت دی جا رہی ہے وہ لوگ ہیں جنہیں) اگر ہم زمین میں اقتدار عطا کریں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دینگے، نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

اِنَّ اللّٰهَ لَيَزَعُ بِالسُّلْطَانِ مَا لَا يَزَعُ بِالْقُرْاٰنِ۔

اللہ حکومت کے ذریعہ سے اُن چیزوں کا سدباب کرتا ہے جن کا سدباب قرآن کے ذریعہ سے نہیں کرتا۔

یعنی جو برائیاں قرآن کی نصیحت اور فہمائش سے نہ دور ہوں ان کو مٹانے اور دبانے کے لیے حکومت کی طاقت کارگر ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک اسلامی ریاست کے قیام کا اصل مقصد اُس اصلاحی پروگرام کو مملکت کے تمام ذرائع سے عمل میں لانا ہے جو اسلام نے انسانیت کی بہتری کے لیے پیش کیا ہے۔ محض امن کا قیام، محض قومی سرحدوں کی حفاظت، محض عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنا اس کا آخری اور انتہائی مقصد نہیں ہے۔ اس کی امتیازی خصوصیت، جو اسے غیر مسلم ریاستوں سے ممتاز کرتی ہے، یہ ہے کہ وہ اُن بھلائیوں کو فروغ دینے کی کوشش کرے جن سے اسلام انسانیت کو آراستہ کرنا چاہتا ہے، اور ان برائیوں کو مٹانے اور دبانے میں اپنی ساری طاقت خرچ کر دے جن سے اسلام انسانیت کو پاک کرنا چاہتا ہے۔ (باقی)